دارُالکُفر کے مُسلمان اَور دارُالاسلام

[یاد ہوگا کہ ماہ شعبان کے پرچے میں ایک صاحب کے سوال پر یہ مختصر جواب دیا گیا تھا کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں باہم شادی بیاہ اور توارث کے تعلقات نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ قرآن کا منشا اس قسم کے تعلقات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس پر جو اعتراضات ہندوستان و پاکستان کے بعض ایسے حلقوں کی طرف سے ہوئے ہیں جنہیں اس مسئلے کی الف ب تک کا علم نہیں ہے وہ تو چنداں قابل توجہ نہیں ہیں۔ البتہ اس باب میں جناب مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب سے ہماری جو مراسلت ہوئی ہے وہ علمی حیثیت سے اس لائق ہے کہ اسے فائدۂ عام کے لیے شائع کیا جائے۔]

مولانا ظفر احمد صاحب کا مکتوب

مکرمی مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب! زادت محاسنکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مجھے آپ سے غائبانہ محبت ہے جس کی شہادت خود آپ کا ضمیر دے گا اور میرا یہ طرز عمل بھی کہ میں گاہے گاہے تھانہ بھون اور ڈابھیل سے آپ کو از خود لکھتا رہا ہوں۔ یہ خط بھی اسی غائبانہ محبت کی بنا پر از خود لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ آج کل بعض علماء نے آپ کی تکفیر و تفسیق کے لیے فتویٰ نویسی شروع کر دی ہے، اور آپ کو جماعتِ اہلِ حق سے جدا سمجھ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اہلِ حق سے الگ نہ کرے۔ پھر کسی کے الگ کرنے کی پروا نہیں ہے

لکل شیئ اذا فارقته عوض

ولیس للہ ان فارقت من عوض

میں نے ترجمان القرآن میں ایک مخدوم زادہ بزرگ کا مضمون پڑھا۔ افسوس ہے کہ انہوں نے تصورِ شیخ کی وہی تصویر پیش کی ہے جس کی بنا پر محققین نے اس کی تعلیم موقوف کی تھی۔ تصورِ شیخ کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وصول الی اللہ کے لیے قلب کو حبِ دنیا اور علائقِ ماسوی اللہ سے پاک وصاف کرنا ضروری ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر چیز کی محبت کو ایک ایک کر کے الگ الگ نکالا جائے۔ یہ راستہ طویل بھی ہے اور بعض کے لیے دشوار بھی۔ اس لیے بعض محققین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان سب پر کسی ایک کی محبت کو غالب کر دیا جائے۔ اس کے غلبہ سے دوسری اشیاء کی محبت مغلوب و مضمحل ہو کر معدوم یا کالعدم ہو جائے گی۔ پھر اس ایک کی محبت کا مغلوب کرنا یا نکالنا زیادہ دشوار نہ ہوگا۔ اس کے لیے محبتِ شیخ کو تجویز کیا گیا کہ اس سے طالب کو فی الجملہ محبت ہوتی ہی ہے اور چونکہ یہ محبت لوجہ اللہ ہے اس لیے اس کا غلبہ محبت حق میں معین ہوگا، اس سے مانع نہ ہوگا۔ جب غلبۂ حبِ شیخ سے دوسری اشیاء کی محبت مغلوب ہو جائے تو حبِ شیخ کو مغلوب کرنے کے لیے تصورِ رسول کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد فنا فی اللہ کا راستہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ مگر جب کم فہموں نے تصورِ شیخ کا مطلب وہ سمجھ لیا جو ہمارے مخدوم زادہ بزرگ نے بیان فرمایا ہے تو محققین نے اس کی تعلیم موقوف کر دی اور اس کو ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون کا مصداق بتلایا۔ اس مسئلہ میں آپ کے رسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی میں دوسرے مسئلہ میں اپنے مخدوم زادہ کی تصدیق کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کی جماعت کے بعض افراد قرآن وحدیث سے براہِ راست استنباط کرنا چاہتے ہیں، اور اس کی پروا نہیں کرتے کہ وہ استنباط فقہاءِ امت کے موافق ہے یا خلاف

اس کی تازہ مثال ترجمان القرآن جلد ۳۶ عدد ۲ بابت شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق جون ۱۹۵۱ء میں ابھی ابھی میری نظر سے گذری - آپ نے دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے تعلقات کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں" پھر ان مہاجرین کے متعلق جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہوں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں فرمایا ہے کہ "ان کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں" الخ ص ۱۲۵/۶۱

آپ کا یہ فتویٰ مذہب حنفی اور جملہ مذاہب اربعہ کے خلاف ہے اور جس آیت سے آپ نے یہ استنباط کیا ہے (والذین آمنوا ولم یھاجروا ما لکم من ولایتھم من شیئ حتی یھاجروا) اس میں اگر ولایت کو بمعنی وراثت تسلیم کر لیا جائے، موالات کے معنی میں نہ لیا جائے، تو یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ ابتداء قدوم مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی، جس کی بنا پر مہاجرین انصار کے اور انصار مہاجرین کے وارث ہوتے تھے، جس کی دلیل اسی آیت کا یہ ٹکڑا ہے ان الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض -

پھر جب مہاجرین و انصار کا باہم توارث سورہ الاحزاب کی آیت النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ من المومنین والمھاجرین الا ان تفعلوا الی اولیائکم معروفا کان ذالک فی الکتاب مسطورا - سے منسوخ ہو گیا تو اب یہ حکم باقی نہ رہا کہ مسلم مہاجر مسلم غیر مہاجر کا وارث نہ ہو، یا برعکس بلکہ آیت المواریث کے موافق توارث

ہونے لگا۔

پھر آپ نے اس پر بھی غور نہ کیا کہ سورۂ الممتحنہ کی آیت ولا تمسکوا بعصم الکوافر واسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا کے نزول سے پہلے تک غیر مسلم عورتیں صحابہ مہاجرین کے نکاح میں بدستور مکہ میں تھیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ وغیرہ نے اپنی کافر عورتوں کو طلاق دے دی تو اُن کا نکاح مکہ کے کافروں سے ہوا۔ حالانکہ مکہ اس وقت صرف دارالکفر ہی نہ تھا بلکہ وہاں کے باشندے محارب بھی تھے جن سے غزوۂ حدیبیہ ۶ھ میں چند سال کے لیے صلح کی گئی تھی۔ تو جس دارالکفر کے باشندے برسرِ جنگ نہ ہوں وہاں کی مسلمان عورتوں سے شادی بیاہ کرو اور وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ توارث کو آپ کس دلیل سے منع کر سکتے ہیں؟

آج ہندوستان جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی برطانیہ کی حکومت میں تھا اور آج جیسا پاکستان دارالاسلام ہے ویسا ہی کسی وقت حیدرآباد بھی دارالاسلام تھا بلکہ کچھ زیادہ کہ وہاں محکمۂ امورِ مذہبی قائم تھا جو اب تک پاکستان میں قائم نہیں ہوا۔ تو کیا آپ اس وقت ہندوستان اور حیدرآباد کے مسلمانوں میں باہم شادی بیاہ اور توارث کو ممنوع سمجھتے تھے؟ یا اس وقت اگر کوئی حاجی مہاجر ہو کر مکہ مدینہ میں رہ جاتا اور اُس کی موت کے وقت مکہ مدینہ میں اُس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو آپ یہ فتویٰ دے سکتے تھے؟ کہ اُس کے ہندوستانی رشتہ داروں کو اس کا ترکہ نہ دیا جائے؟

اگر آپ یہ فتویٰ دیتے ساری دنیا آپ کی مخالفت کرتی۔ حکومت حجاز کا تعامل ٹرکی کے زمانہ میں بھی اور آج بھی یہی رہا ہے اور ہے کہ ایسے لوگوں کا ترکہ ہندوستان کی حکومت کے ذریعہ سے اُن کے ہندوستانی ورثہ کو دے دیا جاتا تھا جبکہ ثبوت مل جاتا کہ اس کے ورثہ موجود ہیں۔ کسی مذہب کے علماء نے بھی حکومتِ حجاز کو یہ فتویٰ نہیں دیا کہ ان حاجیوں کا مال ہندوستانی ورثہ کا نہیں بلکہ حکومت کا حق ہے۔

اور اگر آیت انفال سے مراد ولایت بمعنی وراثت نہیں بلکہ بمعنی موالات ہے تو اس کو میراث اور نکاح سے کوئی علاقہ نہ ہوگا، بلکہ موالات اور ترکِ موالات کا اس میں بیان ہوگا جس میں محاربین اور غیر محاربین کا فرق بھی ہوگا اور مستامن وغیر مستامن کا بھی۔ جس کی تفصیل سورۂ الممتحنہ کی آیات لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین۔ الآیہ کے تحت مفسرین و محدثین و فقہاء نے بہت کچھ بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو شرح السیر الکبیر للامام محمد بن الحسن الشیبانیؒ۔

اخیر میں خیر خواہی کے ساتھ چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

(ا) قرآن سے مسائل و احکام کا استنباط کرتے ہوئے کم از کم احکام القرآن للرازی احکام القرآن لابن العربی تفسیر روح المعانی اور بیان القرآن لحکیم الامۃ التھانوی سے مراجعت ضرور کر لیا کریں۔

(ب) فتویٰ دینے سے پہلے فقہاء حنفیہ کی کتابوں اور اہلِ فتویٰ علماء سے مراجعت فرما لیا کریں۔ کیونکہ فتویٰ نویسی محض کتابوں کے مطالعہ سے نہیں آتی۔ اس کے لیے اہلِ افتاء کے پاس رہ کر مدتوں کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ج) ہم اور آپ مذہب حنفی کے سوا دوسرے مذاہب سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، کیونکہ یہاں دوسرے مذاہب کا درس دینے والے محقق علماء موجود نہیں ہیں۔ اور محض کتابوں میں دوسرے ائمہ کے اقوال دیکھ لینے سے اُن کے مذہب کا پورا علم نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ ہماری کتابوں میں بعض مسائل کے متعلق دوسرے ائمہ کا مذہب غلط لکھ دیا گیا ہے۔ جیسا اُن کی کتابوں میں ہمارا مذہب بعض مسائل میں غلط نقل ہو گیا ہے۔ حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ جیسا محدث، جس کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ ہر بات سند کے ساتھ کہے، اپنی مصنف کے باب آثار علی ابی حنیفہ میں بہت سے مسائل امام صاحب کی طرف غلط منسوب کر گیا ہے جس کا کتب حنفیہ میں پتہ بھی نہیں۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ

جبتک کسی مذہب کو اسی کے علماء سے باقاعدہ نہ پڑھا جائے اس وقت تک اس سے پوری واقفیت نہیں ہوسکتی بعض دفعہ مسئلہ صحیح نقل ہوتا ہے مگر اُس میں جس قدر تفصیل و قیود اصل مذہب میں ہیں وہ سب نقل نہیں کی جاتیں۔

چنانچہ امرأۃ المفقود کے مسئلہ میں ہماری کتابوں میں امام مالک کا مذہب بہت مجمل بیان کیا گیا ہے۔ جب اس مسئلہ کی تحقیق علماء مالکیہ سے کی گئی تو اس میں بڑی تفصیل معلوم ہوئی اور بہت سی قیود و شرائط کا علم ہوا جن کا ہماری کتابوں میں پتہ بھی نہیں۔ ملاحظہ ہو رسالہ الحیلۃ الناجزہ للحلیم الامۃ التھانویؒ۔ پس کسی مسئلہ میں مذہب حنفی کو چھوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ ہم نے مذاہب اربعہ سے خروج نہیں کیا اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں جبتک دوسرے مذاہب کے علماء سے اُس مسئلہ میں مراجعت نہ کر لی جائے۔

(د) "نسبت صوفیہ غنیمتیست کبریٰ اما رسوم ایشاں ہیچ نیرزد" شاہ ولی اللہ صاحب کے اس مقولہ کو پیشِ نظر رکھ کر نسبت صوفیہ کے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے کیونکہ اس کے بغیر درجۂ احسان حاصل نہیں ہوتا جس پر کمالِ ایمان موقوف ہے۔ اور اس نسبت کے لیے رسومِ صوفیہ یا ان کے اشغالِ مروجہ کی اصلاً ضرورت نہیں مگر اہلِ نسبت کی صحبت ازبس ضروری ہے ؎

قال را بگذار مردِ حال شو　　پیشِ مردے کاملے پامال شو

آپ کے قریب ہی . . . . . تشریف فرما ہیں۔ گاہے گاہے اُن کے پاس جاتے رہا کریں۔ امید ہے کہ میری ان باتوں کو خیر خواہی پر محمول کیا جائے گا اور اسی نظر سے خط کو دیکھا جائے گا۔ والسلام

ظفر احمد

جواب

مکرمی و محترمی مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی زاد مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ عنایت نامہ مورخہ ۲۵ جولائی مجھے ذرا دیر سے ملا۔ اسی لیے جواب بھی بتاخیر حاضر ہو رہا ہے۔ اس میں میری کوتاہی نہیں ہے۔

میں آپ کے اخلاص و محبت کا دل سے شکر گزار ہوں، اور مزید شکر گزاری کی موجب وہ علمی رہنمائی ہے جو آپ نے از راہ کرم عنایت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

فتاویٰ کے بارے میں جناب نے بالکل سچ فرمایا۔ میری بھی غایت تمنا بس یہی ہے کہ اللہ کے دربار سے نہ دھتکارا جاؤں، اس کے بعد مذہبی درباروں سے دھتکار دیے جانے کی مجھے پروا نہیں ہے۔

تصورِ شیخ کی جو تعبیر آپ نے پیش فرمائی ہے اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ تدبیر کی حد تک اسے مباح مانا جائے گا اگر آدمی اسی نیت سے اس تدبیر کو اختیار کرے جو آپ نے بیان فرمائی ہے۔ البتہ جو تعبیر حکیم عبدالرشید صاحب نے پیش فرمائی تھی وہ تو سخت خطرناک تھی اور مولانا امین احسن صاحب نے جو گرفت کی تھی اسی پر کی تھی۔

آپ کا یہ ارشاد بجا ہے کہ قرآن سے مسائل و احکام کا استنباط کرتے ہوئے جصاص اور ابن العربی کی احکام القرآن اور تفسیر روح المعانی اور بیان القرآن کا مطالعہ کر لیا جائے۔ الحمدللہ کہ میں پہلے ہی اس مشورے پر عامل ہوں۔ مولانا تھانوی کی بیان القرآن تو میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ متقدم الذکر تینوں کتابیں موجود ہیں اور ہمیشہ آیات سے احکام معلوم کرنے میں تینوں کو بغور دیکھ لیتا ہوں۔ اور صرف انہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ابن کثیر، ابن جریر، اور تفسیر کبیر سے بھی مراجعت کر لیتا ہوں تاکہ مسئلے کے تمام اطراف سامنے آجائیں۔ اس لیے آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں تحقیق و مطالعہ کے بغیر ہی اظہار رائے کر دینے کا عادی ہوں۔ البتہ ایک چیز ضرور ہے جس میں میرا طریقہ آپ حضرات سے مختلف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا، اور جب میں ان کے

بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

فتویٰ دینے کی غلطی میں نے آج تک کبھی نہیں کی۔ فتویٰ جو شخص بھی مجھ سے پوچھتا ہے، میں ہمیشہ اس کو یہی جواب دیتا ہوں کہ مجھے منصب افتا حاصل نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ مسائل میں میری تحقیق پوچھتے ہیں ان کو اپنے علم کے مطابق جواب دے دیتا ہوں۔ اور جواب دیتے وقت فقہ کی مستند کتابوں سے مراجعت کرنے کا پورا التزام کرتا ہوں۔ مطالعہ و تحقیق کے بغیر اظہار رائے سے میں نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی محض اظہار رائے پر اکتفا کر جاتا ہوں اور دلائل و مآخذ بیان کرنے کا موقع نہیں پاتا۔

آپ کا یہ ارشاد بھی بجا ہے کہ کتابوں میں بالعموم اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب کے اقوال ثبت کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس چیز کو میں نے خود محسوس کیا ہے۔ اس لیے میں مذہب حنفی کے سوا دوسرے مذاہب کے اقوال معلوم کرنے کے لیے صرف اُن کتابوں پر اکتفا نہیں کرتا جو فقہاءِ حنفیہ نے لکھی ہیں بلکہ خود ان مذاہب کی اصل کتابیں بھی دیکھ لیتا ہوں۔ مثلاً مذہبِ حنبلی کے لیے المغنی لابن قدامہ، اور مذہبِ مالکی کے لیے المدونہ، وغیرہ۔ نیز میرا تجربہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے اقوال کو الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں کافی احتیاط کے ساتھ ثبت کیا گیا ہے اور بدایۃ المجتہد بھی اس معاملہ میں نسبتہً خاصی قابلِ اعتماد ہے۔ شوکانی کو بھی میں نے اس معاملہ میں خاصا محتاط پایا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر انہوں نے مذاہب کے نقل میں غلطیاں کی ہیں۔ بہرحال ایک مسئلے کی تحقیق میں بہت سے مراجع کی طرف رجوع کرنے سے قریب قریب صحیح واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

صوفیہ کی صحبت سے میں نے اکثر استفادہ کیا ہے۔ ایک مدت تک میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جس باخدا بزرگ کا بھی پتہ چلا ان سے ضرور جا کر ملا اور ان کی صحبت میں بیٹھا۔ میرا اپنا خاندان بھی اہلِ تصوف ہی میں سے ہے اور میرے والد مرحوم تک بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ تصوف کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی میں نے کیا ہے اور متعدد صوفی بزرگوں سے توجہ لینے اور اشغال

سیکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اِس لیے تصوف اور اہلِ تصوف کے بارے میں اپنے جن خیالات اور آراء کی بنا پر میں بدنام ہوں انہیں آپ ایک ایسے شخص کے خیالات اور آراء نہ سمجھیں جو اس کوچہ سے بالکل نابلد ہے۔ میں نے تصوف کو بھی دیکھا ہے اور اہلِ تصوف کو بھی، اور اس کے اچھے اور برے پہلو دیکھ کر ہی ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میں نہیں کہتا کہ جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں اُسے ہر شخص مان لے۔ البتہ یہ ضرور عرض کرتا ہوں کہ میری رائے کو محض ایک سطحی رائے سمجھنے کی غلطی دوسرے لوگ بھی نہ کریں۔ اب بھی مجھے کسی صاحبِ کمال سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں ہے اور میری ہر رائے نظرثانی کے قابل ہے۔ لیکن میں اس کو کیا کروں کہ بہت سے لوگ جنہیں صاحبِ کمال کہا جاتا ہے، میں نے اپنے تجربہ میں ان کو ناقص پایا ہے۔ انہی میں سے ایک وہ بزرگ بھی ہیں جن سے فیض حاصل کرنے کا آپ نے مشورہ دیا ہے۔

اب میں اس مسئلے کی طرف آتا ہوں جس پر آپ نے تفصیلی گفت فرمائی ہے۔ میں نے اس پر جس اختصار کے ساتھ اظہارِ رائے کیا تھا، اسے دیکھ کر شاید آپ نے یہ گمان فرمایا کہ میں اس مسئلے میں فقہاء کے ارشادات سے ناواقف ہوں اور قرآن کی صرف ایک آیت دیکھ کر اظہارِ رائے کر بیٹھا ہوں، حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ دارالکفر کی مسلمان رعایا اور دارالاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کا معاملہ سخت پیچیدہ ہے اور اس معاملہ میں میں نے فقہاء کے بیانات کو بہت ناکافی پایا ہے۔ متقدمین کو تو اس مسئلے سے کچھ زیادہ سابقہ پیش نہیں آیا تھا، اس لیے انہوں نے اس کے سارے اطراف کھول کر بیان نہیں کیے۔ رہے متأخرین، تو ان کو اس سے سابقہ ضرور پیش آیا، مگر وہ نہ تو متقدمین سے کچھ زیادہ مفصل رہنمائی پا سکے اور نہ خود ہی اجتہاد کی جرأت کر سکے۔ اب جو ہم اپنی آزاد حکومت لے کر بیٹھے ہیں تو ہمیں پھر اس مسئلے سے سابقہ پیش آرہا ہے اور قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی کتب فقہ اس معاملہ میں ہماری پوری رہنمائی نہیں کرتیں۔ آپ خود فرما اُن احکام کو جمع فرمائیں جو اس مسئلے کے متعلق کتب فقہ میں ملتے ہیں، اور پھر دیکھیں کہ کیا وہ ہمارے اس وقت کے حالات میں تمام مسائل کا شافی جواب دیتے ہیں؟

دارالاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا، اور دارالکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کا معاملہ محض قانونی نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر سیاسی اور بین الاقوامی تعلقات کے مسائل بھی ساتھ ساتھ اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان جو دارالاسلام کی رعایا ہے، اگر دارالکفر کے کسی شخص کا وارث ہو اور اس کا مفاد اس وراثت سے وابستہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہی وابستگی اس کے لیے فتنہ بن جائے۔ ایک لڑکی جو دارالکفر کی رعایا ہے اور جس کے اعزہ اقربا سب دارالکفر میں رہتے ہیں اور وہاں اپنے مفادات رکھتے ہیں، اگر دارالاسلام میں بیاہی ہوئی آئے تو ہو سکتا ہے کہ اسے غیر مسلموں کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ جاسوسی کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ ایک عورت جو ہجرت کر کے دارالاسلام میں آچکی ہے یا دارالاسلام ہی کی رہنے والی ہے، اس کا شوہر اگر دارالکفر کا باشندہ ہو اور ہجرت کے لیے تیار نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ ہم نہ اس عورت کو اس سے نفقہ دلوا سکتے ہیں۔ نہ ہماری کسی عدالت کا کوئی اختیار اس شخص پر نافذ ہوتا ہے کہ ہم کسی حق کا استقرار کرا سکیں۔ لامحالہ ہمیں اس عورت کو یا تو تمام حقوق سے محروم رکھنا پڑے گا، یا پھر اسے دارالکفر بھیجنا پڑے گا۔ اس طرح کی بہت سی پیچیدگیاں اِن معاملات میں پائی جاتی ہیں جو نری قانونی نوعیت کی نہیں ہیں۔

پھر اس معاملہ میں متعدد معاشی پیچیدگیاں بھی ہیں۔ دارالکفر کی حکومت اپنے علاقہ میں دارالاسلام کی رعایا کے حقوق مالکانہ ساقط کر سکتی ہے یا ان کو طرح طرح کی پابندیوں سے محدود کر سکتی ہے اور دارالاسلام کی طرف دولت کے منتقل ہونے کو روک سکتی ہے۔ مگر ہم دارالاسلام میں دارالکفر کے ایک مسلمان کے حقوق وراثت مان لینے کے بعد انہیں کیسے ساقط کر سکیں گے اور دارالاسلام کے ایک مسلمان کو اپنی دارالکفر میں رہنے والی بیوی کا نفقہ یا مہر ادا کرتے سے کس طرح روک سکیں گے جبکہ یہ شرعی حقوق ثابت ہوں؟ اس طرح دولت کا ایک طرفہ بہاؤ شروع ہو جائے گا جو دارالاسلام کے لیے مضر اور دارالکفر کے لیے مفید ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ دارالکفر میں کروڑوں مسلمان رعایا کی حیثیت سے آباد ہوں اور دارالاسلام کے بے شمار مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہوں یہ نقصان ناقابل لحاظ بھی نہیں رہتا۔

میں اس پیچیدگی پر بہت غور کرتا رہا ہوں اور مجھے نہ کتب فقہ میں اس کا شافی حل مل سکا ہے اور نہ اُن معاملات میں جو ابتداءً چند سال تک مدینہ طیبہ اور مکہ کے مسلمانوں کے درمیان رہے تھے۔ اس لیے میں نے قرآن مجید سے اس کا حل معلوم کرنے کی کوشش کی اور میں نے یہ سمجھا کہ آیت والذین آمنوا ولم یھاجروا ما لکم من ولایتھم من شیءٍ حتی یھاجروا وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق میں اس کا مکمل جواب موجود ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس آیت سے کیا احکام مستنبط ہوتے ہیں اور کس طرح ہوتے ہیں۔

اس آیت میں سب سے اہم لفظ "ولایت" ہے جس کے معنی کا تعین ضروری ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو مجرّد وراثت یا اور کسی ایک معنی پر منحصر کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کی پوری وسعت کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ نصرت، سرپرستی، حمایت، نگہبانی، اور قرابت کے مفہومات پر حاوی ہے۔ ان مفہومات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ "ولایت" سے مراد ایک طرف تو وہ تعلق ہے جو ایک ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ تعلق جو ایک ریاست کے شہریوں میں باہم ہوتا ہے، اور اس کے حدود اُن تمام اقسام کے روابط پر وسیع ہیں جن پر لغت کے اعتبار سے لفظِ ولایت کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی حکومت صرف دارالاسلام ہی کے مسلمانوں کی ولی ہو اور اس کو دارالکفر کے مسلمانوں کی "ولایت" سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ وہ بین الاقوامی پیچیدگیوں میں مبتلا نہ ہو اور ایسے فرائض سے گرانبار بھی نہ ہو جنہیں ادا کرنا عملاً محال ہے۔ اس کے ساتھ قرآن کا منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی مسلم رعایا اور دارالکفر کی مسلم رعایا کے درمیان بھی ولایت کے یہ تعلقات نہ ہوں، بلکہ ان روابط کو دارالاسلام ہی کے مسلمانوں تک محدود رکھا جائے۔

ولایت کا یہ مفہوم اور منشا متعین ہو جانے کے بعد اس آیت سے جو ہدایات نکلتی ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) دارالکفر کی مسلم رعایا کی حمایت و نصرت، سرپرستی و نگہبانی اور پشتیبانی دارالاسلام کی حکومت کے ذمہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اُس حدیث کا بھی ہے جس میں حضور نے فرمایا ہے انا بریٔ من کل مسلم بین ظھرانی المشرکین[1]۔ البتہ اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد مانگیں تو بشرطِ طاقت اُس کافر قوم کے خلاف ان کی مدد کی جاسکتی ہے جس سے ہمارا معاہدہ نہ ہو۔

(۲) دارالکفر کا کوئی مسلمان جو بدستور دارالکفر ہی کی رعایا بنا رہے، دارالاسلام میں آکر مسلمانوں کے ساتھ اُن کے حقوقِ شہریت میں حصہ دار نہیں ہوسکتا، نہ یہ جائز ہے کہ دارالاسلام کی حکومت میں اُسے کوئی ذمہ داری کا عہدہ دیا جائے۔ یہ حقوق اور یہ مناصب اُسے صرف اُسی صورت میں مل سکتے ہیں جبکہ وہ ہجرت کرکے آجائے۔

(۳) دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے، اِلّا یہ کہ دونوں حکومتوں اور قوموں کے درمیان قابلِ اعتماد دوستانہ تعلقات ہوں (لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم[2]) اور ان کے درمیان املاک اور وراثت کے بارے میں مساویانہ معاہدات بھی ہوجائیں تاکہ دونوں کی رعایا ایک دوسرے کی مملکت میں جائدادوں کی مالک و متصرف ہوسکے۔ اس معاملہ میں آپ نے واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض سے جو معارضہ فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ محض مواخاۃ کی بنا پر انصار اور مہاجرین ایک دوسرے کے وارث نہ ہونگے بلکہ وراثت رشتۂ نسب و مصاہرت کی بنا پر ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ یہ آیت دارالاسلام کے مسلمانوں کی میراث اُن اولوالارحام کو پہنچانا چاہتی ہے جو دارالکفر میں رعایا کی حیثیت سے رہتے ہوں اور یہ مطلب آخر کیسے نکالا جاسکتا ہے جبکہ قرآن صاف فیصلہ کرچکا ہے

---

[1] میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔

[2] اللہ تمہیں اس سے نہیں روکتا کہ تم اُن غیر مسلموں سے تعلقات رکھو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، یہ کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان سے انصاف کرو

کہ ان الذین اٰمنوا وھاجروا ۔ ۔ ۔ ۔ والذین اٰووا ونصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض[1]

(۴) دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے درمیان جب ولایت کا تعلق نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ کفالت کا تعلق بدرجۂ اولیٰ نہیں ہے۔ اس لیے کم از کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے درمیان مناکحت پسندیدہ نہیں ہے۔ وہ باہم شادی بیاہ کریں تو نکاح منعقد تو ہو جائے گا، لیکن اچھا یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کریں، اور اسلامی حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس طرح کے رشتوں میں انتظامی احکام کے ذریعہ سے رکاوٹیں ڈالے۔ اور بعض خاص حالات میں ان کو روک دے۔ نیز یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جن کے درمیان پہلے نکاح ہو چکے تھے، اب محض اختلافِ دار کی بنا پر وہ ٹوٹ گئے۔ لیکن اگر ایک منکوحہ عورت، جو دارالاسلام کی رہنے والی ہو، یا ہجرت کر کے دارالاسلام آ چکی ہو، عدالت میں اس بنا پر فسخ نکاح کی درخواست کرے کہ اس کا شوہر دارالکفر کی رعایا ہے اور ہجرت کے لیے تیار نہیں ہے، تو یہ اس کی درخواست کو منظور کرنے کے لیے ایک معقول وجہ ہو گی۔ اس لیے کہ اسلامی حکومت اس عورت کے معاملات کی ذمہ دار ہے اور اس کے حقوق کی نگہداشت اس کا فرض ہے۔ مگر اس کا شوہر اس حکومت کی ولایت سے خارج ہے جس کی بنا پر اس عورت کا کوئی حق بھی اس سے وصول کر کے نہیں دلایا جا سکتا۔ لہٰذا اگر یہ حکومت اسے اس شوہر کی قیدِ نکاح سے نہ چھڑائے گی تو فرائضِ ولایت ادا کرنے میں قاصر رہے گی۔ آپ غور فرمائیں تو یہ بات آپ کو بھی عجیب معلوم ہو گی کہ جس کے ہم ولی نہیں ہیں اس کے حقوق کے تو ہم نگہبان بن کر بیٹھ جائیں مگر جس کے ہم ولی ہیں اس کا کوئی حق بھی نہ دلوائیں اور نہ دلوا سکیں۔

میرے نزدیک اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کا تقاضا بس یہ ہے کہ جس عورت کے پاس نفقہ موجود ہو اور جس کے مبتلائے فتنہ ہو جانے کا بھی کوئی معقول احتمال نہ ہو اس کے لیے تو ایک مناسب مدتِ انتظار تجویز کر دی جائے کہ اس مدت کے اندر اگر اس کا شوہر ہجرت کر کے آ جائے تو

---

[1] جو لوگ ایمان لائے اور (دارالاسلام میں) ہجرت کر کے آ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ اور جنہوں نے مہاجرین کو (دارالاسلام میں) جگہ دی اور انکی مدد کی وہی ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

وہ عورت اسی کی ہوگی، ورنہ اس کے بعد نکاح فسخ ہو جائے گا اور عورت آزاد ہو گی کہ جہاں چاہے نکاح کرلے۔ لیکن جس عورت کے پاس نفقہ نہ ہو، یا جس کے مبتلائے فتنہ ہونے کا معقول احتمال ہو اس کا نکاح بلا تاخیر فسخ کیا جانا چاہیے۔ ہم دارالکفر کے کسی شخص کی خاطر دارالاسلام کی کسی عورت کو نہ تو بھوکا مار سکتے ہیں اور نہ اسے قذف اور زنا کے خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔

آیت لا تمسکوا بعصم الکوافر سے اس موقع پر آپ نے جو استدلال فرمایا ہے وہ بالکل بے محل ہے۔ ہجرت کے موقع پر مہاجرین کے نکاح میں مکہ کی جو غیر مسلم عورتیں تھیں ان کو اس لیے طلاق نہ دی گئی تھی کہ اُس وقت[1] تک مشرکین و مشرکات کے ساتھ مناکحت کی حرمت کا حکم نہ آیا تھا۔ اسی بنا پر وہ مسلمان عورتیں بھی مشرکین کے نکاح میں رہیں جو ہجرت کر کے مدینہ چلی گئی تھیں۔ پھر دونوں مملکتوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو گئی جس کی بنا پر ایک مدت تک یہ طے ہونا مشکل تھا کہ مہاجرین اپنا خرچ کیا ہوا مال مشرکین سے لے کر اپنی مشرک بیویوں کو چھوڑ دیں، اور مشرکین کو ان کا خرچ کیا ہوا مال واپس دے کر ان کی مسلمان بیویوں کو ان کی قیدِ نکاح سے آزاد کرا لیا جائے۔ اس لیے یہ معاملہ صلح حدیبیہ تک ٹلتا رہا اور صلح کے بعد حکم آیا کہ ولا تمسکوا بعصم الکوافر وسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس معاملہ سے آپ زیرِ بحث مسئلہ میں کیا دلیل لا سکتے ہیں اور کیسے؟

آپ نے حیدر آباد اور حجاز اور ٹرکی کے تعامل سے جو استدلال فرمایا ہے وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ جیسا ذی علم اسے پیش کرتا۔ حیدر آباد کی حکومت اپنے محکمۂ امورِ مذہبی کے باوجود دارالاسلام نہ تھی۔ اس کی حیثیت تو دارالکفر کے اندر ایک ذمّی ریاست (Protected State) کی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان بھی انگریز کے ذمّی تھے اور نظام حیدر آباد بھی۔ نظام کی حکومت نے اگر کچھ اسلامی طریقے جاری رکھے تھے تو وہ اُس کے بل بوتے پر نہ تھے بلکہ اس بنا پر تھے کہ انگریز نے اسے ان کی اجازت دے رکھی تھی۔ باقی ماندہ پورے اسلام کو اگر نظام قائم کرنا چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا کیونکہ انگریز اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایسی حکومت کو آخر کس بنا پر دارالاسلام کہا جا سکتا ہے؟

[1] یعنی ہجرت کے وقت

بخلاف اس کے پاکستان میں پورے اسلام کے قیام کا دستوری اعلان ہو چکا ہے اور عملاً اس کے قیام میں اگر کوئی چیز مانع ہے تو وہ پاکستان کے اپنے ہی حکام کا تساہل ہے نہ کہ کسی غیر مسلم طاقت کا تسلط۔ اس لیے پاکستان اور حیدرآباد کے درمیان سرے سے کوئی وجہ مماثلت موجود ہی نہیں ہے کہ ایک کے مسائل کو دوسرے کے مسائل پر قیاس کیا جا سکے۔ رہا ٹرکی اور حجاز کا معاملہ، تو اُن ممالک کے علماء کی جو رائے تھی اسی پر وہاں عمل ہوتا رہا۔ کیا ضروری ہے کہ میں ان کی رائے سے اتفاق ہی کروں؟ آخر آپ کی اور اس ملک کے دوسرے متعدد علماء کی رائے سے بھی تو میں اختلاف کر کے اپنی تحقیق پیش کر ہی رہا ہوں۔ آپ میری دلیل دیکھیے، نہ یہ کہ ٹرکی اور حجاز میں اس کے خلاف کیا عمل ہوتا رہا۔

میں جانتا ہوں کہ میرے سارے استدلال کو یہ کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے کہ بہرحال یہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استنباط ہے اور اس میں یہ پروا نہیں کی گئی ہے کہ یہ استنباط فقہائے امت کے موافق ہے یا مخالف۔ لیکن اگر یہ کسی معقول اور صحیح استدلال کو رد کر دینے کے لیے شرعاً کافی وجہ ہو سکتی ہے تو مجھے اس وجہ کے ماخذ سے مطلع فرمایا جائے ورنہ مجھے معاف فرمایا جائے اگر میں عرض کروں کہ تقلیدِ جامد کی یہی وہ قسم ہے جو علماء کرام کے طعنوں اور ملامتوں کے باوجود ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی ہے۔ والسلام۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

مولانا ظفر احمد صاحب کا دوسرا مکتوب

مکرمی! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دام فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ محبت نامہ میرے خط کے جواب میں موصول ہوا بہت مسرت ہوئی اور دل سے دعائیں نکلیں۔ میں خوش ہوں کہ میری خیر خواہانہ تحریر پر آپ نے خلوص و محبت کی نظر ڈالی اور تفصیل کے ساتھ جواب لکھنے کی زحمت برداشت کی

مجھے آپ سے ایسی ہی توقع تھی۔ اب میں اختصار کے ساتھ چند باتیں اس خط کے متعلق اور عرض کرتا ہوں۔ امید ہے اُن کو بھی خیر خواہی پر محمول فرما کر نظرِ خلوص سے دیکھا جائیگا۔

آپ نے کتب[1] تفسیر کے متعلق فرمایا ہے کہ "میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو بھی حرفِ آخر نہیں سمجھتا"۔ تو ٹھیک اسی طرح اپنی کسی تحقیق کو بھی حرفِ آخر نہ سمجھنا چاہیے بلکہ ایسے مواقع پر صاف لکھ دینا چاہیے کہ عام مفسرین کے بیانات سے میرا اطمینان نہیں ہوا اس لیے غور و فکر کے بعد جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کر لی جائے۔ اور میری تحقیق کو فتویٰ نہ سمجھا جائے کیونکہ مجھے منصبِ افتا حاصل نہیں ہے"۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے، "نیز میرا تجربہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے اقوال کو الفقہ علی المذاھب الاربعہ میں کافی احتیاط کے ساتھ ثبت کیا گیا ہے" الخ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ محض کتابیں دیکھ لینے سے دوسرے مذاہب سے پوری واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اُن مذاہب کے علماء سے اسی طرح اُن کا فقہ نہ پڑھا جائے جس طرح ہم نے فقہ حنفی کو اپنے علماء سے پڑھا ہے۔ کیونکہ فقہی کتابوں میں بالعموم اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب کے اقوال نقل کرنے والے بھی اُن کی کتابوں کو دیکھ کر ہی نقل کرتے تھے مگر پھر بھی اُن سے بہت کچھ خطائیں ہوئی ہیں جس کا سبب بظاہر یہی ہے کہ انہوں نے باقاعدہ ان کے مذاہب کو نہ پڑھا تھا۔ پھر ہم اور آپ کس شمار میں ہیں کہ صرف مطالعہ کتب سے اُن مذاہب کو حاصل کر سکیں۔

میرا تجربہ ہے کہ المغنی لابن قدامہ میں بہت سے مسائل مذہب احمد کی طرف منسوب کیے گئے ہیں حالانکہ علماء حنابلہ کا فتویٰ اُس کے خلاف ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو چہ تصوف سے نابلد نہیں ہیں اور آپ نے تصوف کو بھی دیکھا ہے اور اہلِ تصوف کو بھی۔ مگر بہر حال الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ جس درجہ کی طرف اشارہ ہے اُس کی تحصیل ضروری ہے۔ اس کی ضرورت سے

[1] یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ بیان القرآن آپ کے پاس نہیں۔ شاید اردو میں ہونے کی وجہ سے اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا مگر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بہت عربی تفاسیر سے اُس کا درجہ بلند و بالا ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تبحر علمی علماء عصر کو مسلم ہے۔ انہوں نے بیان القرآن کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ بیان القرآن کو دیکھ کر اردو کتابوں کے دیکھنے کا شوق ہو گیا۔ او کما قال ۱۲ ظ

آپ انکار نہیں کر سکتے اور یقیناً جب تک قرآن وحدیث دنیا میں موجود ہے دنیا محسنین سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اُن کی تلاش ضروری ہے۔ نہ معلوم آپ کے نزدیک معیار کمال کیا ہے؟ صوفیہ کا اصلی کمال یہی نسبت احسان ہے۔ اسی کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے "اذا راٴوا ذکر اللہ"۔ اور یقیناً ایسے لوگ اب بھی ہیں ــــــ مگر اُن کے پاس خالی الذہن ہو کر جانا چاہیے ناقدین کر نہ جانا چاہیے کہ ناقدانہ نظر سے تو رسول کے کمالات بھی مخفی ہو جاتے ہیں دلی کس شمار میں ہے ؟

لے فرمایا ہے "نسبت صوفیہ غنیمت کبریٰ ہے" اور اسکی علامت حدیث میں یہ ہے

دارالاسلام کی مسلمان رعایا اور دارالکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کے معاملہ میں شرح السیر الکبیر للامام محمد بن الحسن الشیبانی کا مطالعہ ضروری ہے وہ ان شاء اللہ اس باب میں شافی کافی ہے۔ آپ نے جو سیاسی اور بین الاقوامی اُلجھنیں اہل دارین کے توارث وتناکح میں بیان فرمائی ہیں وہ تو دارالکفر کے مسلمانوں کی ہجرت میں بھی موجود ہیں تو کیا ہجرت کو بھی اس خیال سے بند کر دیا جائے گا کہ مبادا یہ لوگ جاسوس بن کر آتے ہوں۔ بالخصوص ہندو رعایائے پاکستان کی واپسی ہندوستان سے تو بالکل بند کر دینی چاہیے کہ اُن پر تو سو فیصدی جاسوسی کا شبہ ہے۔ بلکہ پاکستان سے باقیماندہ ہندوؤں کو بھی نکال دینا چاہیے کہ ان پر مار آستین ہونے کا شبہ ہے۔ نیز پاکستان کے تاجروں کا ہندوستان مال لے کر جانا بھی روک دیا جائے۔ اسی طرح وہاں کے تاجروں کا پاکستان آنا بھی۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہو سکتا ہے، پھر توارث وتناکح ہی میں یہ احتمالات مانع کیوں بن گئے ؟ ان پیچیدگیوں کا جو علاج قرآن نے بتلایا ہے یا ایھا الذین اٰمنوا اذا جاءکم المومنات مھاجرات فامتحنوھن وہی سب صورتوں میں بروئے کار لایا جائے گا۔ حکومت کو اُن لوگوں پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے جو پاکستان سے باہر جاتے آتے یا ہندوستان سے نکاح ووراثت کا تعلق رکھتے ہیں مگر نفس تناکح وتوارث کو ان احتمالات کی بنا پر ممنوع نہیں کر سکتے جبکہ ہجرت اور

تجارت کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ تجارت کا دروازہ کھولنے سے پاکستان کا وہ مال بھی پاکستان سے باہر جا رہا ہے جس کو حکومتِ پاکستان برآمد نہیں کرنا چاہتی اور مسلم مہاجرین اور ہندو مہاجرین میں بعضے پاکستان آکر جاسوسی بھی کرتے ہیں۔

آیت والذین اٰمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیئ حتی یھاجروا۔ میں اُس وقت کا حکم ہے جبکہ ہجرت فرض اور شرطِ قبولِ اسلام تھی۔ حدیث انا بریئ من کل مسلم بین ظھرانی المشرکین بھی اُسی وقت کے متعلق ہے۔ اور اُس وقت حکومتِ مدینہ مہاجرین کی آبادکاری کی ذمہ دار تھی۔ مگر آپ کی حکومت تو اس کی ذمہ داری نہیں لیتی بلکہ مہاجرین کی آمد کو روکنا چاہتی ہے۔ اور جو پاکستان آگئے ہیں اُن کو بھی ہندوستان واپس کرنا چاہتی ہے۔ اور جو ہندو یہاں سے چلے گئے ہیں ان کو واپس بلانا چاہتی ہے۔ اس حالت میں جو مسلمان دارالکفر کی رعایا بنے ہوئے ہیں مجبور ہیں اُن پر اس آیت کے احکام چسپاں کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس لیے جب تک ہندوستان کے مسلمانوں پر ہجرت کو فرض نہ کیا جائے اور جب تک حکومتِ پاکستان ان چار کروڑ مسلمانوں کی آبادکاری کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے اُس وقت اُن تمام احکام کو ثابت نہیں کیا جا سکتا جو آپ اس آیت سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

جن مفسرین نے اس سے مسلمین دارالاسلام و دارالکفر کے مابین قطعِ توارث سمجھا ہے اور ولایت کو وراثت کے معنی میں لیا ہے وہی اس آیت کو سورۂ احزاب کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ من المومنین والمھاجرین سے منسوخ مانتے ہیں۔ چونکہ آپ نے بھی اس سے قطعِ توارث پر استدلال کیا ہے اس لیے میں نے کہا تھا کہ پھر اُن مفسرین کی طرح اس حکم کو سورۂ احزاب کی آیت سے منسوخ بھی ماننا چاہیے۔ یہ تعارض میں نے پیدا نہیں کیا بلکہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔

آپ تو دارالکفر کے مسلمانوں کو دارالاسلام میں حقوقِ شہریت اور ذمہ داری کے

عہدے دینے سے انکار کرتے ہیں مگر حکومتِ پاکستان دارالکفر کے کفار کو پاکستان میں حقوقِ شہریت اور ذمہ داری کے عہدے دے رہی ہے۔ غالباً ابھی تک بہت سے انگریز بڑے بڑے عہدوں پر ہیں اور بہت سے ماہرین کو امریکہ و لندن وغیرہ سے بلایا جا رہا ہے۔ اور غالباً آپ بھی اس کو شرعاً ممنوع نہ کہیں گے ورنہ پاکستان ترقی نہ کر سکے گا۔ پھر مسلم غیر مہاجر ہی کیوں خطاوار ہے؟

دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمانوں میں کفاءت کی نفی کرنا نرالی تحقیق ہے۔ کیا ایک سید ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے سید نہ رہے گا جلاہا بن جائے گا؟ آخر قطع ولایت سے (اگر تسلیم بھی کر لی جائے) نفیٔ کفاءت کیونکر لازم آگئی؟

جو عورت مہاجرہ ہو کر دارالاسلام میں آجائے اور شوہر دارالکفر میں رہنے پر مصر ہو اُس کے لیے اوّل شوہر سے طلاق حاصل کرنے کا حکم ہے۔ اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم مرافعہ کے بعد طلاق واقع کر سکتا ہے۔ اِس مسئلہ کو آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے لیے دوسرے دلائل ہیں جن سے فقہاء نے تعرض کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الحیلۃ الناجزہ لحکیم الامۃ التھانویؒ۔

آیت ولا تمسکوا بعصم الکوافر استدلال کے لیے نہیں بلکہ آپ کو الزام دینے کے لیے لکھی تھی کہ آپ تو آیت والذین اٰمنوا ولم یھاجروا ما لکم من ولایتھم من شیءٍ سے باہم مسلمانوں کے درمیان قطع ولایت کے قائل ہو رہے ہیں حالانکہ آیت ولا تمسکوا بعصم الکوافر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم مہاجر و غیر مہاجر کے درمیان بھی قطع ولایت اس سے پہلے نہ ہوئی تھی، کیونکہ نکاح بھی ولایت کے مفہوم میں داخل ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ اس آیت کے نزول تک مشرکین و مشرکات کے ساتھ مناکحت کی حرمت کا حکم نہ آیا تھا الخ، محتاجِ دلیل ہے۔ آیت ولا تنکحوا المشرکات حتیٰ یؤمنّ ..... ولا تنکحوا المشرکین حتیٰ یومنوا (سورۂ بقرہ) اس سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت سے ابتداءً نکاح مابین مسلم و کافرہ و برعکس حرام ہو گیا۔ نکاح سابق کا انقطاع نہ ہوا تھا۔ وہ سورۂ ممتحنہ کی آیت سے ہوا۔ سو یہ میرے مدعا کے لیے مؤید ہے کہ مسلم مہاجر اور کافرہ غیر مہاجرہ کے درمیان اُس وقت تک ولایت باقی تھی تو آپ مسلم و مسلمہ کے درمیان قطع ولایت کے کیسے قائل ہیں؟

مَیں پھر عرض کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استنباط کو میں منع نہیں کرتا، مگر اس کے لیے جس قدر وسعت نظر فی الحدیث اور معرفت ناسخ و منسوخ و معرفت اقوالِ فقہاءِ سابقین کی ضرورت ہے یہ شرط ہم میں اور آپ میں مفقود ہے اس لیے یقیناً ہم سے بڑی بڑی خطاؤں کا ارتکاب ہوگا۔ سلامتی اسی میں ہے کہ جب کسی مسئلہ میں فقہاءِ سابقین کا فیصلہ نہ ملے علماءِ وقت سے مراجعت کی جائے۔ شاید کسی کو کچھ مل جائے۔ یا کم از کم اپنی تحقیق کو حرفِ آخر نہ سمجھا جائے اور صاف لکھ دیا جائے کہ اس مسئلہ میں فقہاءِ سلف کے کلام میں کوئی جزئیہ نہیں ملا، مَیں نے قرآن و حدیث سے یہ سمجھا ہے دوسرے علماء سے بھی تحقیق کر لی جائے اور میری تحقیق کو فتویٰ نہ سمجھا جائے والسلام۔

ظفر احمد عثمانی

جواب

محترمی و مکرمی جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا۔

میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ مَیں نے کبھی اپنی کسی تحقیق کو، دوسروں ہی کے لیے نہیں خود اپنے لیے بھی، حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ میری ہر رائے قابلِ نظرِ ثانی ہے۔ جب کبھی مجھ پر خود مزید مطالعہ

و تحقیق سے اپنی کوئی غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس کی اصلاح کر لیتا ہوں اور اس کا اظہار بھی کر دیتا ہوں۔ اور جب کبھی کسی کی تنقید سے، خواہ وہ کتنی ہی مخالفانہ و معاندانہ ہو، بدلائل میری کوئی غلطی مجھ پر ظاہر ہو جاتی ہے، اس سے رجوع کرنے میں مجھے تامل نہیں ہوتا۔ اس بات کا بھی بارہا اظہار کر چکا ہوں کہ فقہی مسائل میں اپنی تحقیق سے جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے وہ کوئی فتویٰ نہیں ہے بلکہ ایک اظہار رائے ہے تاکہ اہل علم اس پر غور کریں، اگر میری تحقیق سے مطمئن ہوں تو قبول کریں ورنہ دلیل سے اس کو رد کر دیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر علمی بحث یا ہر اظہار رائے کے ساتھ اس بات کی تصریح کر دینا مشکل ہے۔

مولانا تھانویؒ کی بیان القرآن سے میں نے کبھی کبھی استفادہ کیا ہے۔ پٹھان کوٹ کے قیام کے زمانہ میں وہ ہمارے کتب خانہ میں موجود تھی۔ مگر ہمارا جو ذخیرہ وہاں رہ گیا اس میں جہاں اور بہت سی کتابیں ضائع ہوئیں وہاں ایک یہ کتاب بھی تھی، اب رفتہ رفتہ اس نقصان کی تلافی کی جا رہی ہے اور از سر نو کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ مجھے علم کے معاملہ میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ متقدمین کی طرح معاصرین سے بھی استفادہ کرتا ہوں اور عربی کی طرح اردو میں بھی کہیں علم موجود ہو تو اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

مجھے آپ کی اس رائے سے جزوی اتفاق ہے کہ دوسرے مذاہب کی پوری واقفیت ان کے علماء سے پڑھے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے اس جزو سے اتفاق نہیں ہے کہ اس طرح کی "پوری واقفیت" کے بغیر ہمارے سے بحث و تحقیق ہی بند ہو جانی چاہیے۔ اگر یہ بات درست ہو تو آخ ہمارے مدارس دینیہ میں درس حدیث و فقہ کے موقع پر مذہب حنفی کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے ہوئے جو بحثیں کی جاتی ہیں ان میں کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟ نیز اسلام اور دوسرے ادیان یا اسلامی قانون اور دوسرے قوانین کے تقابل پر ہم جو کچھ لکھتے اور بولتے رہتے ہیں اس کے لیے بھی کیا وجہ جواز باقی رہتی ہے جبکہ ہم نے ان کی کتابوں کو استادوں سے سبقاً سبقاً نہیں پڑھا ہے؟ میرے خیال میں صحیح یہ ہے کہ جتنی کچھ بھی تحقیق کتابوں کے ذریعہ سے ممکن ہو کرنی چاہیے

اور اصلاح کے لیے تنقید پر اعتماد کرنا چاہیے۔ آخر ہم مغربی علوم و فنون اور قوانین کے بارے میں بھی تو اُن کی کتابوں ہی کو پڑھ کر کلام کرتے ہیں۔ ہر چیز کو سبقاً سبقاً تو نہیں پڑھتے۔ ہماری تحریریں ہر طرح کے اہلِ علم تک پہنچتی ہیں اور جس معاملہ میں بھی کوئی غلطی ہوتی ہے کوئی نہ کوئی باخبر آدمی اس پر ٹوک دیتا ہے۔ اس طرح تمام علمی مسائل میں حقائق کی تنقیح اور غلطیوں کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور علمی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ صرف ایک فقہ ہی کیوں ایسی چھوئی موئی ہو کہ اس میں بحث و تحقیق کا کام صرف اس اندیشے سے بند رکھا جائے کہ کہیں کسی مذہب فقہی کے بیان میں ہم سے غلطی سرزد نہ ہو جائے؟ اور اس طرح کی احتیاط اگر متقدمین نے برتی ہوتی تو ہم تک ان کی وہ بیش قیمت تحقیقات کیسے پہنچتیں جن میں بیشمار مفید چیزوں کے ساتھ ساتھ آپ کے اپنے بیان کے مطابق غلطیاں بھی ہیں؟ بحث و تحقیق میں احتیاط تو ضروری ہے مگر نہ اتنی احتیاط کہ یا تو سرے سے بحث و تحقیق ہی بند کر دی جائے یا اس کے لیے ایسی شرطیں لگا دی جائیں جو پوری نہ ہو سکتی ہوں۔

درجۂ احسان کی اہمیت اور اس کے حاصل کرنے کی ضرورت سے انکار کا کیا موقع ہے، میرے نزدیک تو وہی اصل میں مطلوب ہے۔ اور میں اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ محسنین سے خدا کی زمین کبھی پہلے خالی تھی نہ اب خالی ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی ہیں خدا کی رحمت کا ایک نشان ہیں اور ان کی صحبت، معیت، رفاقت ہمارے لیے سرمایۂ سعادت ہے۔ مگر طولِ بحث سے بچتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جہاں بالعموم ان لوگوں کے زیادہ پائے جانے کا گمان کیا جاتا ہے وہاں یہ سب سے کم پائے جاتے ہیں، اور جن گوشوں کو "اہلِ فن" اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ احسان کی کوئی جھلک تک ان میں دیکھنے کی توقع نہیں رکھتے، وہیں یہ اکثر مل جاتے ہیں۔ اہلِ فن میں جن شخصیتوں کو مزکّی اور مُزکّی ہونے کی شہرت حاصل ہے ان میں بہتوں کے ساتھ مجھے کسی نہ کسی طور پر سابقہ پیش آیا ہے اور میں نے اُن کے اندر وہ وہ کمزوریاں پائی ہیں جو معمولی انسانوں کے لیے بھی موزوں نہیں ہیں کجا کہ ماہرینِ تزکیۂ نفس کے لیے۔ اس کے برعکس غیر معروف لوگ، جو دنیا کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور جنہیں شاید کوئی مرتبہ بھی اہلِ فن کے ہاں نہیں مل سکتا، ان کے اندر ایسے ایسے بندۂ حق ملے ہیں جو خوفِ خدا سے کانپنے والے

اور اس کی رضاجوئی کے لیے ہر فائدے کو قربان اور ہر نقصان کو گوارا کرنے والے ہیں اور جنہیں قبولِ حق اور ادائے حق سے نہ کوئی نفسانیت باز رکھ سکتی ہے اور نہ کوئی عصبیت۔

شرح السیر الکبیر بلاشبہ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ایک بہترین کتاب ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے علاوہ مبسوط اور دوسری کتابوں کے بھی وہ ابواب پڑھے ہیں جو بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دارالکفر اور دارالاسلام کے تعلقات پر تو بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، مگر افسوس ہے کہ دارالکفر کی مسلم رعایا اور دارالاسلام کے تعلقات کا پہلو اُن سب میں بہت تشنہ ہے۔ میں آپ سے پھر گذارش کروں گا کہ اس خاص پہلو پر متقدمین کی کتابوں میں جو بحثیں ہیں آپ ایک مرتبہ پھر اُن کا جائزہ لے کر دیکھیں اور اس وقت کے حالات پر ان کو منطبق کرنے کی کوشش فرمائیں، مجھے توقع ہے کہ اس کے بعد آپ کو خود بھی ان کی تشنگی کا احساس ہو جائے گا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو دور ہمارے ہاں فقہی اجتہاد کے لیے ممتاز رہا ہے اُس میں سارے مسلمان دارالاسلام ہی کی رعایا تھے اور کم ہی ایسا اتفاق ہوا تھا کہ کوئی بڑی مسلم آبادی کفار کی رعیت بنی ہو۔ بعد میں جب بڑی بڑی مسلم آبادیاں کفار کی رعیت بن گئیں تو اس وقت اجتہاد کا دروازہ قریب قریب بند ہو چکا تھا۔ اس لیے ہمارے قانون کا یہ شعبہ بڑی حد تک تشنۂ تفصیل رہ گیا۔ پھر موجودہ زمانہ کی ہمہ گیر قومی ریاست سے تو مسلمانوں کو پہلے کبھی سابقہ پیش ہی نہیں آیا تھا جس میں ریاست کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کر کے کافر اکثریت مسلمانوں پر اپنی تہذیب و تمدن اور قوانینِ حیات ہی کو نہیں بلکہ اپنے نظریات و تخیلات اور احساسات تک کو مسلط کر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح کی غیر مسلم قومی ریاست کا معاملہ تو اُس دارالکفر کے معاملہ سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے جہاں مسلمانوں کو ایک "ذمّی قوم" کی سی پوزیشن دی گئی ہو، اور یہ معاملہ اُس سے زیادہ گہری نظر چاہتا ہے جس سے آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔

اس معاملہ میں اصل تصفیہ طلب چیز یہ نہیں ہے کہ جاسوسی کے امکانات کہاں کہاں ہیں اور ان کو کس طرح بند کرنا چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ وہ "ولایت" جس کو دارالاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا اور

دارالکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات سے ساقط کیا گیا ہے، کن معنوں میں ہے اور اس کے حدود کیا ہیں، اور اس کے سقوط کے عملی اثرات و نتائج کیا ہیں۔ میں اس کے جو معنی اور حدود بیان کر رہا ہوں اگر آپ کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو آپ خود بیان فرمائیں کہ آپ اس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں۔

آپ کا یہ معارضہ البتہ وزنی ہے کہ جب دارالاسلام نے اپنے دروازے ہجرت کے لیے بند کر رکھے ہوں تو وہ احکام موجودہ حالات پر کیسے منطبق ہونگے جو ہجرت کی فرضیت کے زمانے میں دیے گئے تھے۔ مگر میری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احکام تو بلاشبہ ہجرت کی فرضیت کے زمانے میں دیے گئے تھے، لیکن "سقوطِ ولایت" ہجرت کی فرضیت پر موقوف نہیں ہے بلکہ مجرد اختلافِ دارین اس کا مبنیٰ ہے۔ اگر آپ میری اس بات کو نہیں مانتے تو کیا آپ یہ فرماتے ہیں کہ جب دارالاسلام کی حکومت تمام کافر حکومتوں کی مسلم رعایا کو ہجرت کی دعوت نہ دے سکتی ہو تو اس صورت میں وہ اُن کی پوری مسلم رعایا کی ولی ہے؟ اور کیا اس صورت میں دارالاسلام کے مسلمان بھی دارالکفر کے مسلمانوں کے ولی ہوں گے؟ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ جو دارالاسلام اتنا کمزور ہو کہ اپنے قریب ترین دارالکفر کی مسلم آبادی کو بھی پناہ نہ دے سکتا ہو وہ اس کی ولایت کا حق ادا کرنے سے بدرجۂ اولیٰ قاصر ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو حقائق اور مصالح اس ولایت کے سقوط کے مقتضی ہیں ان کا کوئی تعلق بھی ہجرت کے وجوب و عدمِ وجوب سے نہیں ہے۔ اُن کی بنیاد تو دراصل یہ ہے کہ جو مسلمان ایک غیر مسلم حکومت کے تابع امر ہیں اُن کی ولایت کا بار سنبھالنا مسلم حکومت کے لیے عملاً غیر ممکن ہے، اور مزید برآں اگر مسلم حکومت اُن کی ولی بننے کی مدعی ہو، اور اس ولایت کا حق ادا کرنے کے لیے ہمسایہ غیر مسلم حکومتوں کے دائرۂ اقتدار میں مداخلت کرے، یا کم از کم نظری حیثیت ہی سے اپنے لیے اس مداخلت کا حق محفوظ رکھے، تو یہ چیز اس کو اُن تمام غیر مسلم حکومتوں سے ایک دائمی آویزش میں مبتلا کر دے گی جن کے تحت مسلمان آباد ہوں۔

آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ ولایت کے اسقاط کا یہ حکم دارالکفر کے مسلمانوں کو محض ہجرت نہ کرنے کی سزا دینے کے لیے تھا۔ اس لیے آپ کو یہ اعتراض ہے کہ جب ہم اُن پر ہجرت کا راستہ

نہیں کھول رہے ہیں تو اُن کو یہ سزا کیوں دی جائے۔ مگر جو بات میں نے اوپر عرض کی ہے اُس پر اگر آپ غور فرمائیں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ کا یہ اعتراض دور ہو جائے گا۔ وجوبِ ہجرت کی صورت میں ہجرت نہ کرنے کی سزائیں دوسری ہیں جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔ اِن سزاؤں کو (جو صرف وجوبِ ہجرت کی صورت کے لیے مخصوص ہیں) بین الاقوامی قانون کی مستقل دفعات کے ساتھ (جن کا مبنیٰ مجرد اختلافِ دار ہے خواہ ہجرت ممکن اور واجب ہو یا نہ ہو) خلط ملط کر دینے سے بڑی غلط فہمیاں لاحق ہو سکتی ہیں۔

بیرونی ممالک سے ماہرین کی خدمات حاصل کرنا اور چیز ہے اور کسی کو حقوقِ شہریت دے کر اُن تمام رازوں اور ذمہ داریوں میں شریک کر لینا جن میں صرف شہری ہی شریک ہو سکتے ہیں، بالکل ہی ایک دوسری چیز۔ ضرورت کے وقت شریعت ہمیں باہر سے ماہرین کی خدمات حاصل کرنے سے نہیں روکتی۔ مگر یہ بات، کم از کم میرے علم میں تو، قرآن کی دی ہوئی ہدایات کے بالکل خلاف ہے کہ جو شخص ایک غیر مسلم حکومت کی رعایا ہو، اور جس کے سارے مفادات دارالکفر سے وابستہ ہوں، اُس کو ہم اپنے ہاں سفیر اور وزیر اور سکرٹری وغیرہ بنائیں۔

قطعِ ولایت سے مطلق کفاءت کی نفی کا دعویٰ میں نے کب کیا تھا کہ اس سے دارالکفر کے کسی سیّد کا غیر سید ہو جانا لازم آئے۔ میرا مدعا تو یہ تھا کہ مناکحت میں جس کفاءت کا اعتبار کیا جاتا ہے وہ صرف انہی لوگوں کے درمیان معتبر ہے جن کے درمیان موالاۃ ہو۔ جہاں سرے سے موالاۃ ہی نہ ہو وہاں کفاءت اگر نسب یا دوسرے وجوہ سے موجود بھی ہو تو وہ شادی بیاہ کے لیے کوئی موزوں بنیاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ مناکحت سے زوجین کے جو قانونی حقوق ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں ان کی بنیاد کفاءت پر نہیں بلکہ ولایت پر قائم ہوتی ہے۔ اگر ولایت نہ ہو تو ان حقوق کے استقرار میں کفاءت کچھ بھی مددگار نہیں ہوتی۔ دارالکفر کے ایک سید صاحب دارالاسلام کی ایک سیدانی کے باعتبار نسب کفو ہی سہی، مگر یہ کفاءت اس غریب کو مہر، نفقہ، اور دوسرے حقوقِ زوجیت دلوانے میں آخر کیا مدد کر سکتی ہے؟

تاہم، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، میری اس تقریر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے درمیان مناکحت حرام ہے، یا ان کے سابق نکاح اختلافِ دارین سے آپ ہی آپ ٹوٹ گئے ہیں، یا آئندہ ان کے درمیان نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جن زوجین کے درمیان اختلاف دار واقع ہو چکا ہے ان کی طرف سے اگر فسخِ نکاح کی درخواست ہماری عدالت میں آئے تو وہ قابلِ لحاظ ہونی چاہیے، اور یہ کہ آئندہ اس طرح کے رشتے کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے یہ دونوں عنایت نامے اور ان کے جواب فائدۂ عام کے لیے جُوں کے توں شائع کیے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنے پہلے جواب میں کچھ تشریحات کا اضافہ کر دیا ہے جو اصل خط میں نہ تھیں۔ اُن کے متعلق کچھ فرمانا چاہیں تو ترجمان القرآن کی دوسری اشاعت میں آپ کے ارشادات کو جگہ دے دی جائے گی۔ تازہ پرچہ جس میں یہ دونوں خطوط اور جوابات شائع کیے جا رہے ہیں انشاء اللہ جلدی حاضرِ خدمت ہوگا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ